رفاقت علی شاہد

# تدوینِ کُلّیاتِ میرؔ کی ضرورت و اہمیت اور چندا کا برِ تحقیق و تنقید

اردو زبان اس حوالے سے بدقسمتی کا شکار رہی ہے کہ اس کو پروان چڑھانے والے ایسے کتنے ہی شاعرو ادیب آج بھی حق شناسی کے منتظر ہیں جنھوں نے گلشنِ اردو کو اپنے خونِ جگر سے سینچ کر بارآور کیا، ان کے حالات و کلام سے آج ہم ناواقف محض ہیں۔ زندہ قومیں اپنے ثقافتی و ذہنی ورثے کو محفوظ رکھتی ہیں اور اس ورثے کی موجودگی اور تاثیر پذیری انھیں احساس رفعت سے سرفراز کرتی ہے۔ افسوس! اُردو کم و بیش پانچ سو سال کی طویل زندگی گزارنے کے بعد اور بیسویں اور اکیسویں صدی عیسوی کے ترقی یافتہ دور میں سانس لیتے ہوئے بھی محرومِ توجہ اور اپنوں کے التفات کی منتظر ہے۔

اُردو کے ساتھ ہم نے بیگانگی، بے حسی اور حق ناشناسی کا ایسا رویہ اختیار کر رکھا ہے جس کی توقع کسی زندہ قوم سے ہرگز نہیں کی جاسکتی۔ ایک طرف ہم اردو زبان کے بنیاد گزاروں اور اس کے گیسو سنوارنے والوں سے قطعی لاتعلقی ہو چکے ہیں تو دوسری جانب اردو کو اپنا کہتے ہوئے ہم دوسروں کے سامنے خود کو شرمسار محسوس کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے۔ ہم نے اپنے ان اسلاف کا حق ادا نہیں کیا جنھوں نے اُردو کی خدمت کرنے میں اپنی زندگیاں گزار دیں۔ اسلاف کے اس عظیم الشان مجمعے میں میر تقی میرؔ ہمیں سب سے آگے دکھائی دیتے ہیں۔ اردو زبان اور اردو ادب کی خدمت گزاری میں جو کاوشیں میر صاحب نے کیں اور اُردو کو بامِ عروج تک پہنچانے میں جو کردار انھوں نے ادا کیا، وہ بے



مثال اور قابلِ تقلید ہے۔ اُس کردار کو بھلائے نہیں بھلایا جاسکتا اور اُردو کے لیے عظیم خدمات انجام دینے کی حقیقت کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

میرؔ صاحب کی اُردو زبان و ادب کے لیے ان خدمات کا اعتراف ہر دور میں آنے والے صاحبِ نظر و سخن ادیبوں اور شاعروں نے کیا، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس عتراف کا اظہار عموماً واہ واہ کی صورت میں کر کے حق شناسی کا فرض ادا کرنے کو کافی جانا گیا۔ زیادہ ہوا تو میر صاحب کا کچھ کلام گوا کر اور کچھ نصاب میں شامل کر کے میر صاحب کی حق شناسی کا ڈھول پیٹا جانے لگا۔ اللہ اللہ! خیر سلاّ!

خدا بھلا کرے عسکری صاحب اور شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا جنھوں نے ہمیں میرؔ صاحب کا حقیقی مرتبہ دکھایا۔ اُنھوں نے ہمیں سمجھایا کہ میرؔ صاحب کیا تھے، اُن کا فن کیا تھا، اُن کی عظمت کیا تھی اور وہ فن کار کیسے تھے۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ لیکن عسکری صاحب اور فاروقی صاحب کو پڑھنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں میرؔ صاحب کو دیکھ رہا ہوں۔ دور سے بھی دیکھ رہا ہوں، نزدیک سے بھی دیکھ رہا ہوں، پر جب میں ان کی باتیں سننے کی خواہش کا اظہار کرتا ہوں تو منھ ہی نہیں کھولتے۔ میں نے میر صاحب کا نظارہ تو کر لیا لیکن ان کے منھ سے وہ نہیں سن سکا جس نے اُنھیں ''خدائے سخن'' کہلوایا۔ میں نے تجسس کیا کہ کیا وجہ ہے، میرؔ صاحب کلام کیوں نہیں کرتے۔ ہمیں اپنی میٹھی میٹھی اور دہلی کی ٹکسالی زبان سے محروم کیوں رکھا ہے۔ تو مجھ پر کھلا کہ میرؔ صاحب نے تو بہت باتیں کیں، وہ بہت بولے ہیں۔ ہم نے یہ خرابی کی کہ اب تک میرؔ صاحب کی باتیں ویسے لکھ کر آگے نہیں پہنچائیں جس طرح انھوں نے کی تھیں۔ اسی لیے میر صاحب چپ ہیں۔ وہ اپنی زبان نہیں بگاڑ سکتے۔ وضع دار، سچے، ذمے دار اور خالص وطنی لوگ ہیں۔ دلّی کی ٹکسال سے باہر ایک لفظ بھی نہ بول سکتے ہیں نہ سننے کا یارا رکھتے ہیں۔

سو بھائیو! ہم نے میر صاحب کو چپ کرا دیا، گونگا کر دیا۔ اُنھوں نے جو کہا، جیسے کہا، سب موجود ہے۔ ہم ہی نے اسے طاق میں، عجائب گھروں اور کتب خانوں کی آہنی الماریوں میں مقید رہنے دیا اور اپنی ناقص فہم کے مطابق میرؔ صاحب سے منسوب کر کے ایسی ایسی باتیں پھیلا دیں جن کا انتساب بھی میر صاحب کے لیے باعثِ ننگ ہوگا۔ ہم نے اپنی نالائقی اور فرض ناشناسی چُھپانے کے لیے میرؔ صاحب

کو''خدائے سخن'' کا جھنجھنا دے کر بہلانے کی لاکھ کوشش کی لیکن حق اور سچ چُھپانے سے کہیں چُھپتا ہے۔

اس غیر تحقیقی ''پیش لفظ'' کے بعد میں تحقیق کی جانب آتا ہوں۔ ہم نے میر صاحب کو ''خدائے سخن'' تو کہہ دیا لیکن جب خدائے سخن کے کلام کی بات آتی ہے تو اس کے استناد پر ہم بغلیں جھانکنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے بڑا لمحۂ فکر یہ ہے کہ دُنیا کی تیزی کے ساتھ ترقی کرتی ہوئی اور ہر دل عزیز زبان اردو کے خدائے سخن کا جو کلام موجود ہے، وہ غیر مستند ہے۔ میر صاحب کو دنیا سے اُٹھے دو صدیاں گزر گئیں اور ہم آج بھی میر صاحب کا وہی غیر مستند، ناقص اور بعض حوالوں سے گم راہ کن کلام پڑھنے اور اس پر سر دُھننے پر مجبور ہیں۔ میر صاحب کے کُلّیات کی تحقیقی تدوین آج بھی اردو دنیا پر قرض ہے۔ اردو میں جدید تحقیق و تدوین کی عمر بھی سو سال کے قریب ہو چلی ہے لیکن افسوس کہ آج بھی ''کُلّیاتِ میر'' کی تحقیقی تدوین ہم اردو والوں کے لیے حسرت زدہ خواہش کی تصویر بنی ہوئی ہے۔

''کُلّیاتِ میر'' کی تحقیقی تدوین کا شدید احساس گزشتہ ایک صدی کے دوران وقتاً فوقتاً ہوتا رہا ہے۔ قاضی عبدالودود، مولانا امتیاز علی عرشی اور رشید حسن خان جیسے صفِ اوّل کے محققین سمیت بعض علمائے ادب یہ احساس دلاتے رہے لیکن ان سب کے لیے بھی یہ بھاری پتھر ہی ثابت ہوا جسے اُنھوں نے چوم کر چھوڑ جانے ہی میں عافیت سمجھی۔ یہاں میں ایسے ہی علمائے اُدب کے مذکورہ بیانات کا قدرے تفصیل سے ذکر کرتا ہوں۔

قاضی عبدالودود کو رشید حسن خان نے تحقیق کا معلم ثانی کہا ہے۔ اردو تحقیق میں قاضی صاحب کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ''کُلّیاتِ میر'' کی تحقیقی تدوین کا احساس قاضی صاحب کو بھی تھا۔ ''کُلّیاتِ میر'' کی پہلی اشاعت ۱۸۱۱ء پر تبصرہ کرتے ہوئے اُنھوں نے لکھا:

> ''۱۲۲۶ھ کے بعد 'کُلّیاتِ میر' کا کوئی نسخہ شائع ہوا ہے تو تجارتی اغراض سے، ہندوستان و پاکستان کے کسی ادبی ادارے کو اس کی طرف توجہ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ یہ جس قدر شرم ناک ہے، اسی قدر یہ امر قابلِ ستائش ہے کہ فورٹ ولیم کالج کے اربابِ حل و عقد کو آج سے کم و بیش ڈیڑھ سو برس قبل کلیات کی اشاعت کا خیال آیا۔''[1]

قاضی صاحب کا کہنا درست اور تجزیہ برحق، لیکن اُنھوں نے خود ''کُلّیاتِ میر'' کی تحقیقی تدوین کرنے یا



کرانے کے سلسلے میں کوئی عملی قدم اٹھایا ہو، اس کی کوئی شہادت ہمارے پاس موجود نہیں۔ قاضی صاحب کے دور میں کلامِ میر کے قلمی و مطبوعہ نسخوں کے بارے میں معلومات کا حصول اور معلومہ نسخوں تک براہِ راست رسائی یقیناً مشکل ہوگی لیکن قاضی صاحب نے میر کا کچھ کلام دریافت کیا اور میر پر تحقیقی و تنقیدی مضامین و مقالات بھی لکھے۔[2] ان کی تحریروں سے علم ہوتا ہے کہ اُن کی رسائی کلامِ میر کے چند اہم قلمی نسخوں تک یقیناً تھی، اس کے باوجود قاضی صاحب نے تدوینِ ''کُلّیاتِ میر'' کے لیے کوئی عملی کوشش نہیں کی۔ اس کی دو وجوہات فوری طور پر سمجھ میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ قاضی صاحب کی طبیعت تدوین و ترتیب کے لیے موزوں نہیں تھی۔ اسی لیے اپنی تحقیقی زندگی میں وہ اُردو کا وہ کوئی اچھا تدوینی نمونہ نہیں چھوڑ سکے۔ ان کی تدوینیات میں 'مآثرِ غالب'' اور ''تذکرہ مسرت افزا'' اہم ہیں اور یہ دونوں فارسی میں ہیں۔ دوسرے، قاضی صاحب کو اس کا بھی پورا احساس ہوگا کہ ''کلیات میر'' کی تدوین میں کافی نسخے پیش نظر رکھنے لازمی ہیں۔ ان نسخوں کے حصول میں مشکلات اور مطلوبہ وقت کی طوالت اور پھر تدوینِ کلیات میں طویل عرصے کے صرفے کا احساس، ان سب نے اُنھیں ''کلیاتِ میر'' کی تدوین سے باز رکھا ہوگا۔ قاضی صاحب کے دور میں قلمی نسخوں تک رسائی کے مسائل اور وسائل کی کمی نے اس کام کو مزید مشکل بنا دیا ہوگا۔ بہر حال، قاضی صاحب کو ''کلیاتِ میر'' کی تحقیقی تدوین کی اہمیت کا احساس تھا۔

مولانا امتیاز علی عرشی کو اُردو تحقیق اور تدوین میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ غالبیات اور دیگر موضوعات پر اُن کی تحقیقی تحریریں طلبائے تحقیق کے لیے راہ نما ہیں۔ اس کے ساتھ انھوں نے اردو متون کی تدوین میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ غالبیات میں ''دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی'' اور ''مکاتیبِ غالب'' اور دیگر میں شعرائے اردو کا تذکرہ ''دستور الفصاحت'' اُن کے نمایاں اور بے مثل تدوینی کارنامے ہیں۔ اُنھوں نے ''کُلّیاتِ میر'' کے نسخۂ رضائیہ رام پور کا تعارف کراتے ہوئے ''کُلّیاتِ میر'' کی تدوین سے متعلق لکھا:

> ''میر جیسے اُستاد کا کلیات نہیں، کوئی ایک دیوان بھی اس اہتمام سے شائع نہیں کیا گیا، جس کا وہ مستحق تھا۔ میر ان استادوں میں مانے جاتے ہیں جن کا ایک ایک لفظ زبان کے لیے سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ لغت اور قواعد کی کون سی معتبر کتاب ایسی ہوتی ہے جس میں ان کے کلام سے استشہاد نہ پایا جاتا ہو۔ پھر کیا

بحالاتِ موجودہ یہ بات بآسانی ممکن نہیں کہ جس لفظ یا محاورے کو اہلِ لغت یا صاحبانِ قواعد میر کا جان کر نقل کر رہے ہوں، وہ سرے سے میر کا رہینِ قلم ہی نہ ہو، بلکہ کاتب کا سہو یا اُس کا تصرف ہو۔ ایسی صورت میں لغت اور قواعد دونوں سنورنے کی جگہ الٹے بگڑ جائیں گے اور اردو پر یہ ظلم اردو کے دوستوں کے ہاتھوں ہوگا۔''

> دنیا کی کوئی ترقی یافتہ زبان ایسی نہیں جس کے اساتذہ کا کلامِ نظم ونثر اپنی صحیح ترین شکل میں شائع نہ ہو چکا ہو۔ اردو باوجود ترقی یافتہ ہونے کے اس معاملے میں بڑی بدنصیب ہے۔ اس کے دل دادہ اپنی آنکھوں کی خاطر تو دو چار خوب صورت کتابیں چھاپ چکے ہیں لیکن خود زبان کی صحیح شکل کی بقا کے لیے کچھ کرتے نظر نہیں آتے۔ علی گڑھ، دہلی، لکھنؤ اور الہ آباد کے اردو شعبے بڑے دیدہ ور اساتذہ کی نگرانی میں کام کر رہے ہیں۔ اگر وہ ادھر توجہ کریں، تو چند سال کے اندر میر اور سودا جیسے اساتذہ کا کلام خوب اور خوب تر نہیں۔ بلکہ خوب ترین صورت میں اربابِ علم کے ہاتھوں تک پہنچ سکتا ہے۔ کیا اچھا ہو، اگر ان مرکزوں کے اساتذہ مل کر ایک جامع اسکیم تیار کریں اور پھر تقسیم کار کر کے اپنے پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کے طلباء سے ایک ایک دیوان ایڈٹ کرا کے حکومتِ ہند کی مدد سے چھاپ دیں۔''(۳)

اس اقتباس میں عرشی صاحب نے نہ صرف میر اور دیگر اساتذہ اُردو کے کلام کی تحقیقی تدوین پر زور دیا ہے، بلکہ اس کام کی اہمیت بھی واضح کی ہے۔ یہ سب اپنی جگہ قابلِ ستائش ہے لیکن مجھے دو باتوں پر اعتراض ہے؛ اوّل یہ کہ عرشی صاحب دوسروں کو کلامِ میر اور دیگر اساتذہ کے کلام کی تدوین پر تو اُکسا رہے ہیں لیکن خود اس سلسلے میں کوئی قدم نہیں اٹھاتے۔ دوسرے، وہ جامعاتی تحقیق کاروں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ میر اور سودا جیسے اساتذہ کا کلام تدوین کے اصولوں کے مطابق مدوّن کر سکیں گے۔



آج کا ذکر رہنے دیجیے، جب یہ مضمون لکھا گیا اور شائع ہوا (۱۹۶۲ء) تب مذکورہ جامعات میں ایسے کون سے اساتذہ تھے جو تحقیق و تدوین کے اعلیٰ ذوق سے متصف تھے اور اپنے طلبہ سے میر اور ان جیسے دیگر اساتذۂ سخن کا کلام اصولِ تدوین کے مطابق مدون کرا سکتے تھے؟ عرشی صاحب کا جامعات اور ان کے اساتذہ سے اعلیٰ تدوینی کاموں کا مطالبہ کرنا حیرت انگیز ہے۔

عرشی صاحب کے پاس وسائل تھے۔ وہ رضا لائبریری، رام پور کے نگران اور کتاب دار تھے۔ رضا لائبریری میں ''کُلّیاتِ میر'' کا ایک نادر نسخہ بھی ہے جس کا تعارف بھی عرشی صاحب نے کرایا اور اس کی اہمیت واضح کی۔ ہندوستان کے دیگر کتب خانوں تک بھی ان کی رسائی تھی۔ مختصر یہ کہ ''کُلّیاتِ میر'' کی تدوین کے سلسلے میں جتنے وسائل اور جتنی آسانیاں عرشی صاحب کو حاصل تھیں، وہ کسی اور کے حصے میں نہیں آئیں۔ وہ چاہتے تو ''دیوانِ غالب، نسخۂ عرشی'' کی طرح میر کی کلیات یا منتخب کلام (دیوان یا قصائد یا مثنویات وغیرہ) مدوّن کر سکتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عرشی صاحب کو میر سے زیادہ غالب کے ساتھ طبعی مناسبت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تدوین کے علاوہ تحقیق میں بھی انھوں نے غالبات پر اتنے مضامین و مقالات تحریر کیے جن سے غالبیات پر ان کے ایک یا دو مجموعے مرتب ہو سکتے ہیں۔ یہاں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ عرشی صاحب کوشش کرتے تو وسائل کی حد تک مدد کر کے کسی کو ''کُلّیاتِ میر'' مدون کرنے کی تشویق دلا سکتے تھے۔

رشید حسن خان نے بھی ''کُلّیاتِ میر'' کی تحقیقی تدوین کا احساس دلایا ہے۔ اُردو میں تدوین کی نصف صدی کا جائزہ لیتے ہوئے اپنے مقالے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ واقعہ ہے اور سخت کہ بیش تر بنیادی مآخذ تدوین کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ مثلاً میر خدائے سخن ہیں، مگر آج کے دن تک ان کا کلیات آدابِ تدوین کے ساتھ مرتب نہیں ہو سکا ہے۔''(۴)

رشید حسن خاں اُردو کے رجحان ساز اور اُصول ساز محقق و مدون ہیں۔ ''فسانۂ عجائب''، ''باغ و بہار''، ''گلزارِ نسیم''، ''سحر البیان''، ''مثنویاتِ شوق''، ''زٹل نامہ''، ''مصطلحاتِ ٹھگی'' وغیرہ ہم اُن کی تدوین کے بے مثال شاہ کار ہیں۔ اُردو میں، بلا مبالغہ، ان سے بڑا مدوّن اور صاحبِ نظر محقق نہیں گزرا۔ انھیں بجا طور پر تشویش تھی کہ اردو کے خدائے سخن میر کا کلام ابھی تک اس تحقیقی سنجیدگی کے ساتھ

مدون نہیں ہوا جس کا وہ حق دار ہے۔ میرؔ ہی کیوں، اردو کے دیگر اساتذۂ سخن کا کلام بھی ہنوز تشنۂ تدوین ہے۔ غالبؔ ذرا زیادہ خوش قسمت نکلے کہ انھیں مولانا امتیاز علی خاں عرشی جیسا مدوّن مل گیا جس نے تدوینِ کلامِ غالبؔ کا حق ادا کر دیا۔

مختصراً، رشید صاحب کو میرؔ کے کلام کی تحقیقی تدوین نہ ہونے کی کمی کا شدید احساس تھا لیکن ان کے معاملے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے ''کُلّیاتِ میرؔ'' کی تدوین خود کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اپنے مذکورہ بالا بیان سے قبل وہ مطلع کرتے ہیں:

> ''اب [۱۹۹۷ء؟] سے تقریباً ۲۵ سال پہلے ترقیِ اردو بورڈ [نئی دہلی، اب قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان] کی طرف سے شہباز حسن صاحب نے مجھ سے 'کُلّیاتِ میرؔ' مرتب کرنے کی فرمائش کی۔ میں نے کلیات کے تیس نسخوں کی فہرست بنا کر بھیجی کہ ان کے عکس منگا دیے جائیں، کوشش کی جائے گی کہ پانچ یا چھے سال میں تدوین کا کام مکمل ہو جائے۔ کہا گیا کہ ہمارے پاس ایسا انتظام کرنے کی گنجائش نہیں، یہ ہمارے اصول و قواعد کے تحت نہیں آتا، میں نے معذرت کر لی۔''[۵]

رشید صاحب کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ انھیں وسائل میسر نہیں تھے، جس کی وجہ سے وہ ''کُلّیاتِ میرؔ'' کی تدوین کو اپنے تدوینی منصوبوں میں شامل نہ کر سکے۔ انھوں نے تیس نسخوں کی فہرست دی تھی۔ اس میں یقینی طور پر چار پانچ مطبوعہ اور باقی قلمی نسخے ہوں گے۔ میرا محتاط اندازہ ہے کہ اب تازہ معلومات کی روشنی میں مطلوبہ نسخوں کی تعداد میں اضافہ کرنا پڑے گا۔ رشید صاحب کے پاس مآخذ اور وسائل نہیں تھے۔ ان کے دور تک، اور جس زمانے کی بات وہ کرتے ہیں ۔۱۹۷۲ء کے آس پاس کی، تب اردو کے قلمی نسخوں کے بارے میں معلومات محدود تھیں اور بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے خاص طور پر اُن اہم قلمی نسخوں کی فہرست تیار کی ہے جن کا ''کُلّیاتِ میرؔ'' کی تدوین کے دوران پیشِ نظر رہنا ضروری ہے۔ میری تحقیق اور معلومات کے مطابق ایسے قلمی نسخوں کی تعداد تیس سے پینتیس تک ہے۔ اس کے ساتھ پانچ چھ مطبوعہ نسخے بھی پیشِ نظر رہنے چاہییں۔

رشید حسن خاں کا سب سے بڑا مسئلہ قلمی و مطبوعہ نسخوں کی فراہمی رہا ہے۔ انھوں نے جو متون



مدوّن کیے ہیں، اُن کے مقدموں میں وضاحت کے ساتھ ان متون کے اہم قلمی و مطبوعہ نسخوں کی فراہمی میں مشکلات کا ذکر کیا ہے۔ رشید صاحب کو دو طرح کے مسائل کا سامنا رہا۔ اوّل تو یہ کہ اُن کے تعلقات محدود تھے۔ مقتدر افراد میں سے بہت کم سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔ وجہ اُن کی محققانہ طبیعت اور بے لاگ رائے کا اظہار کرنا تھا۔ اسی وجہ سے وہ بہت سے ایسے افراد سے تعاون حاصل نہ کر سکتے تھے جو وسائل مہیا کرنے میں ممد ثابت ہو سکتے تھے۔ بہت کم اہلِ علم ان سے تعاون کے لیے تیار ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے انھیں اپنے تدوینی کاموں میں نوع بہ نوع مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ''کُلّیاتِ میرؔ'' کی تدوین میں تو یہ مشکلات کہیں زیادہ تھیں۔ تیس قلمی و مطبوعہ نسخوں کی عکس نقول کی فراہمی کے لیے بہت سے اہلِ علم اور دیگر افراد کی اعانت درکار تھی جو رشید صاحب کو حاصل نہ تھی۔ غالباً اسی وجہ سے انھوں ''کُلّیاتِ میرؔ'' کی تدوین جیسے اہم کام کو اپنے تدوینی منصوبوں میں شامل نہیں کیا۔

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری اردو کے غیر محتاط محقق ہیں۔ ان کی تحقیق کی خاص بات معلومات کی فراوانی ہے۔ تحقیق کے گہرے تجزیاتی مطالعے سے انھیں مناسبت نہ تھی، اسی لیے ان کے تحقیقی مضامین میں تحقیقی گہرائی کے بجائے معلومات کی بہتات نظر آتی ہے۔ ایک بات البتہ وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اہم اور غیر اہم کی تمیز انھیں خوب تھی۔ چنانچہ اپنے تحقیقی مضامین میں انھوں نے جو معلومات پیش کی ہیں، وہ اہم موضوعات سے متعلق ہونے کے باعث تحقیق و تدوین کے اہم مآخذ میں شمار کرنے کے قابل ہیں۔

کلامِ میرؔ کی تدوین سے وہ بھی بخوبی واقف تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے کلامِ میرؔ کے چند قلمی نسخوں کا تفصیلی تعارف بھی کرایا اور دیوانِ اوّل میرؔ کے نسخۂ محمود آباد کو بنیاد بنا کر میرؔ کا دیوانِ اوّل بھی مرتب کیا جو پہلے سری نگر اور بعد میں لاہور سے شائع ہوا۔[۶] سر دست اس دیوان کی ترتیب پر اظہارِ خیال کو ملتوی کر کے اصل موضوع کی جانب رجوع کرتا ہوں۔

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری نے کم سے کم دو مقامات پر کلامِ میر کی تدوین کی ضرورت واضح کی ہے:

> ''خدائے سخن میر تقی میرؔ کو مرے ہوئے پونے دو سو سال کا عرصہ گزر گیا ہے۔ اس طویل مدت میں کسی صاحب ذوق کو صحیح ڈھنگ سے 'کُلّیاتِ میرؔ' ایڈٹ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔''[۷]

وہ مزید لکھتے ہیں کہ ''نسخۂ کلکتہ درست نہیں ہے۔اس لیے [کذا= لیے ]اس کے بعد جتنے بھی نسخے اس کی پیروی میں شائع ہو چکے ہیں، ان سب کا یہی حال ہے، یعنی نامکمل اور غلط۔''[۸] ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری کے دونوں بیانات درست ہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ انھوں نے یہ بیانات تحقیقی تجزیے اور غائر مطالعے کے بعد نہیں دیے، بلکہ ان کا مقصد اپنی ''دریافتوں'' کو زیادہ اہم گرداننے کا پرچار کرنا ہے۔ گزشتہ دوسوسال میں اگر کسی نے بھی کلامِ میر کو صحیح ڈھنگ سے مرتب یا مدوّن نہیں کیا تو اکبر حیدر کاشمیری نے میر کا جو دیوانِ اوّل مرتب کیا، وہ بھی تدوین کا کوئی اچھا نمونہ پیش نہیں کرتا۔

ڈاکٹر محمود الٰہی بھی اُردو کے دوسرے درجے کے محقق تھے۔ان کے تحقیق و ترتیبی کاموں میں گہرائی اور آدابِ تدوین کی مکمل پیروی نہیں ملتی۔ وہ صاحبِ مطالعہ اور علمی طبیعت کے مالک تھے۔ ادبی و تحقیقی معاملات پر گہری نظر رکھتے تھے۔''کُلّیاتِ میر'' کی تحقیقی تدوین کی ضرورت سے وہ بھی پوری طرح باخبر تھے۔''کُلّیاتِ میر'' کے نسخۂ صولتیہ (صولت پبلک لائبریری، رام پور) کا تعارف کراتے ہوئے اُنھوں نے لکھا:

> ''اردو میں تحقیق کا کارواں بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے لیکن یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ ابھی تک بڑے بڑے شاعروں کے دواوین اور کلیات کی ایڈیٹنگ اور تدوینِ نو کی طرف خاص توجہ نہیں کی گئی ہے۔ ہمارے بڑے شاعروں میں صرف غالب کا دیوان (نسخۂ عرشی) ایسی صورت میں شائع ہوا ہے جسے محققانہ تدوین کا اعلیٰ نمونہ کہا جاسکتا ہے۔سودا اور میر کا جو کلیات متداول ہے، وہ الحاق و التباس سے پاک نہیں ہے... ہند و پاک کی دانش گاہوں میں اب ایڈیٹنگ کا کام شروع ہوگیا ہے اور اُمید ہے کہ 'کُلّیاتِ میر' کا بھی کوئی تحقیقی ایڈیشن شائع کیا جائے گا۔''[۹]

جس وقت ڈاکٹر محمود الٰہی نے یہ مضمون لکھا اور شائع کرایا (۱۹۶۱ء کے قریب)، تب اردو میں تحقیق و تدوین کا معیار بہت اچھا تھا، (تو وہ خود صفِ اوّل کے محقق نہ سہی) اسی لیے وہ جامعاتی محققین سے توقع رکھنے میں حق بجانب تھے۔اب تو اس زمانے کو گزرے بھی نصف صدی سے زائد کا عرصہ ہوگیا ہے۔اس نصف صدی کے عرصے میں اردو تحقیق و تدوین جس قدر سرعت کے ساتھ زوال پذیر ہے، اسے دیکھتے



ہوئے جامعاتی محققین سے تو اب کوئی توقع کرنا بے جا ہے۔ دیگر محققین و مدوّنین سے (اگر ان کی معتدبہ تعداد موجود ہے تو) بھی کوئی امید نہیں لگائی جاسکتی۔

محققین کے علاوہ کچھ دیگر اہلِ علم و نقد نے بھی کلامِ میر کی تدوین کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ آلِ احمد سرور ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''اردو شعر و ادب کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کے باوجود یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ابھی تک ہمارے بہت سے امامانِ فن کے کلیات و دواوین یا تو دستیاب ہی نہیں ہوتے یا ملتے ہیں تو بہت غلط ہیں اور ان کی کتابت و طباعت بھی قابلِ اطمینان نہیں ہے۔اس لیے [کذا= لیے ] اس وقت سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ تمام اساتذہ کے کلام کے مستند ایڈیشن صاف ستھری کتابت و طباعت کے ساتھ شائع ہوں، تا کہ ایک طرف ادب سے دل چسپی رکھنے والوں کی ذہنی غذا کا سامان ہو سکے اور دوسری طرف تحقیق و تنقید زیادہ صحیح بنیادوں پر ہو سکے۔
> ...'کُلّیاتِ میر' کے ایک ایسے مستند ایڈیشن کی ضرورت سختی سے محسوس کی جارہی تھی جو دیدہ زیب بھی ہو۔''[۱۰]

ان سے بہت پہلے میرزا یاس یگانہ چنگیزی نے بھی موجودہ کلامِ میر کے غلط ہونے کا اندازہ لگایا تھا۔ ان کے مطابق:

> ''خدائے سخن حضرت میر تقی میر کا کُلّیات اتنا غلط چھپا ہے کہ کسی صفحے کو اوّل سے آخر تک صحیح پڑھنا بہت مشکل ہے...کتابت کی غلطیوں نے میر کے کلام کو... مسخ کر دیا ہے۔''[۱۱]

اس کے بعد یگانہ چنگیزی نے پانچ صفحات میں مثالیں پیش کر کے کلامِ میر میں امکانی غلطیوں کی نشان دہی کی ہے۔انھوں نے تصحیح کے ذریعے ان الفاظ کے وہ متبادل درج کیے ہیں جو امکانی طور پر (ان کے مطابق) میر نے استعمال کیے ہوں گے لیکن کتابت (اور ترتیب) کی غلطی سے متن میں غلط طور پر درج ہو گئے ہیں۔

مندرجہ بالا بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو ادب کے محققین و ناقدین کو شروع سے احساس تھا

کہ ''کُلّیاتِ میرؔ'' کی تحقیقی تدوین کی اشد ضرورت ہے۔ وسائل کی کمی، وقت کی قلت اور کام کی طوالت کے باعث یہ ضرورت ابھی تک قائم ہے اور کسی شوریدہ سر مدوّن کی راہ دیکھ رہی ہے۔

## حواشی

۱۔ قاضی عبدالودود، کُلّیاتِ میرؔ کی اوّلین اشاعت مشمولہ دلّی کالج میگزین اُردو [ایوننگ کلاسز] دلّی، 'میرؔ نمبر' مرتبہ نثار احمد فاروقی، نومبر ۱۹۶۲ء، ص ۳۹۱۔

۲۔ قاضی عبدالودود نے میر تقی میرؔ (میریات) پر جو تحقیقی و تنقیدی مقالے اور مضامین لکھے، ان کا عکس ایک مجموعے میں شائع کر دیا گیا ہے۔ میرؔ کے عنوان سے یہ مجموعہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ نے ۱۹۹۵ء میں شائع کیا۔ اس کی ترتیب امکانی طور پر عابد رضا بیدار نے کی۔

۳۔ مولانا امتیاز علی عرشی، کُلّیاتِ میرؔ کا ایک نادر نسخہ مشمولہ دلّی کالج میگزین محولہ بالا، ص ۳۷۹، ۳۸۰۔

۴، ۵۔ رشید حسن خان، اردو میں تدوین کے پچاس سال مشمولہ تدوین... تحقیق؛ روایت (مجموعۂ مضامین مصنف)، ناشر مصنف، دہلی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۹۰۔

۶۔ (الف) اکبر حیدری کاشمیری (مرتب) دیوانِ میرؔ، اوّل، سری نگر: جموں و کشمیر کلچرل اکادمی، اشاعتِ اوّل، ۱۹۷۴ء، بحوالہ مضمون میر کی دو اہم مثنویاں از اکبر حیدری کاشمیری مشمولہ ماہ نامہ نیا دور لکھنؤ، مئی جون ۲۰۱۰، 'میر تقی میرؔ نمبر'، ص ۱۱۔

(ب) ________، مشمولہ نقوش لاہور، شمارہ ۱۲۵ (اکتوبر ۱۹۸۰ء) 'میر تقی میرؔ نمبر ۱' (نسخۂ لاہور)۔

۷۔ ________، میرؔ کا دیوانِ چہارم (نسخۂ محمود آباد) مشمولہ نقوش لاہور، شمارہ ۱۳۱ (اگست ۱۹۸۳ء) 'میر تقی میرؔ نمبر ۳'، ص ۴۸۹۔

۸۔ ________، میرؔ کی دو اہم مثنویاں مشمولہ ماہ نامہ نیا دور لکھنؤ، جلد ۶۵، شمارہ ۲۔۳، مئی جون ۲۰۱۰ء، 'میر تقی میرؔ نمبر'، ص ۱۳۔

۹۔ محمود الٰہی، کُلّیاتِ میرؔ کا ایک نادر قلمی نسخہ مشمولہ سہ ماہی اردو ادب علی گڑھ، شمارہ ۴، ۱۹۶۱ء، ص ۵۔

۱۰۔ آلِ احمد سرور، میرؔ کے مطالعے کی اہمیت مشمولہ نقوش لاہور، شمارہ ۱۲۶، نومبر ۱۹۸۰ء، 'میر تقی میرؔ نمبر ۲'، ص ۲۲۴۔

۱۱۔ میرزا یگانہؔ چنگیزی، میرؔ کا کلام، ایضاً ص ۳۸۴۔



## مآخِذ


۱۔ خاں، رشید حسن، اردو میں تدوین کے پچاس سال مشمولہ تدوین... تحقیق؛ روایت (مجموعۂ مضامینِ مصنف)؛ ناشر مصنف، دہلی؛ ۱۹۹۹ء۔

۲۔ سرور، آلِ احمد، میرؔ کے مطالعے کی اہمیت مشمولہ نقوش لاہور، شمارہ ۱۲۶، نومبر ۱۹۸۰ء، 'میر تقی میرؔ نمبر۔۲'، ص ۲۲۴۔

۳۔ عبدالودود، قاضی، کُلّیاتِ میرؔ کی اوّلین اشاعت مشمولہ دلّی کالج میگزین اُردو [ایوننگ کلاسز]، دلّی، نومبر ۱۹۶۲ء 'میرؔ نمبر'، ص ۳۸۱۔

۴۔ عرشی، امتیاز علی، مولانا، کُلّیاتِ میرؔ کا ایک نادر نسخہ مشمولہ دلّی کالج میگزین اردو [ایوننگ کلاسز]، دلّی، نومبر ۱۹۶۲ء، 'میرؔ نمبر'، ص ۳۶۷۔

۵۔ کاشمیری، اکبر حیدری، میرؔ کا دیوانِ چہارم (نسخۂ محمود آباد) مشمولہ نقوش لاہور، شمارہ ۱۳۱، اگست ۱۹۸۳ء، 'میر تقی میرؔ نمبر۔۳'، ص ۴۸۹۔

۶۔ ________، میرؔ کی دو اہم مثنویاں مشمولہ ماہ نامہ نیا دور لکھنؤ، جلد ۶۵، شمارہ ۲۔۳ مئی جون ۲۰۱۰ء، 'میر تقی میرؔ نمبر'، ص ۱۱۔

۷۔ محمود الٰہی، ڈاکٹر، کُلّیاتِ میرؔ کا ایک نادر نسخہ مشمولہ سہ ماہی اردو ادب علی گڑھ، شمارہ ۴، ۱۹۶۱ء، ص ۵۔

۸۔ یگانہؔ چنگیزی، مرزا واجد حسین یاس، میرؔ کا کلام مشمولہ نقوش لاہور، شمارہ ۱۲۶، نومبر ۱۹۸۰ء، 'میر تقی میرؔ نمبر۔۲'، ص ۳۸۴۔